موجودہ سیاسی صورتحال اور اقبال

ڈاکٹر سلیم اختر

"قومی اسمبلی میں رقص، گالیاں، باکسنگ اور ارکان آؤٹ، ہنگامے کے دوران ارکان گتھم گتھا ہو گئے، ٹائیاں کھل گئیں، بٹن ٹوٹ گئے۔"

موجودہ سیاسی بحران اور اقبال" جیسے اہم موضوع پر مقالہ رقم کرنے لگا تو ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء کے روزنامہ "جنگ" کی پانچ کالمی شہ سرخیاں قوم کا منہ چڑا رہی تھیں۔ ایسی اخباری سرخیاں جو اب تو ہماری اسمبلیوں کی مستقل کارروائی کی بازگشت میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ مقام بدل جاتا ہے، اراکین بدل جاتے ہیں، ماہ و سال بدل جاتے ہیں مگر اسلوب دشنام کا رنگ چوکھا ہوتا رہتا ہے۔ علامہ اقبال نے تو بہت پہلے ہی "الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت" کو "آزادی کے پھندے" قرار دے کر بحیثیت مجموعی جو "نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے" کہا تھا تو پون صدی بعد آج اس کی تلخ صداقت پہلے سے بھی زیادہ آشکار ہو چکی ہے کہ اسمبلیاں اب "عفونت میں سنڈاس سے بدتر" ثابت ہو رہی ہیں۔

جس ملک نے اپنی عمر کا تقریباً نصف دور عسکریت کی زد میں بسر کیا ہو اور جہاں جمہوریت محض تجربہ کی حد تک ہو تو ایسے میں جمہوریت کے کمزور پودے کو باہمی رواداری، باہمی احترام اور باہمی اتفاق کے آب حیات بخش سے آبیاری کے برعکس نفرت، خشونت، دشنام اور غیض و غضب کے آب زنگ سے سینچنا دانش مندی کا تقاضا نہیں، اس لئے نہیں کہ یہ حکمران پارٹی کے نقطۂ نظر سے معیوب ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ اگر یہی طرز عمل شعار گلشن قرار پا جائے تو سبھی خار بداماں نظر آئیں گے۔

پاکستان کے تشکیلی محرکات کیا تھے اور مذہبی، تہذیبی، ثقافتی اور اقتصادی عوامل کی کارفرمائیاں کیا تھیں، حصول پاکستان کی جدوجہد نے کیسی کیسی قربانیاں طلب کیں، کن خونیں حالات میں پاکستان معرض وجود میں آیا اور لاکھوں افراد کیسے آگ اور خون کا دریا عبور کر کے خوابوں کی سرزمین میں وارد ہوئے —— یہ سب اس زندہ تاریخ کے ابواب ہیں جس میں ہم سب کردار کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے اس ضمن میں تکرار اور اعادہ کی ضرورت نہیں، لیکن اس امر کا تعین تو کیا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے؟

تاہم اس نوع کے مطالعات کے ضمن میں ایک الجھن بھی ہے۔ علامہ اقبال کے افکار و تصورات کی مشترک فکری اساس اور مخصوص تاریخی تناظر فراموش کر کے اور ان کے پیغام کی کلیت سے صرف نظر کر کے اجزا کی صورت میں افکار و تصورات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کلیات اقبال کو ڈیپارٹمنٹل سٹور کی حیثیت دے کر حسب منشاء اشعار اور مطالب و معانی اخذ کئے جاتے ہیں اسی لئے متضاد خیالات' برعکس نظریات اور متناقص آراء کے لئے کلام اقبال سے شواہد تلاش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ حاکم محکوم' ظالم مظلوم' قائد عوام' معلم طالب علم' ملا سوشلسٹ' شوہر بیوی سبھی اقبال سے شہادت حاصل کرتے ہیں تو بنیادی وجہ فکر اقبال کا تضاد نہیں بلکہ فکر اقبال کی کلیت اور اس کے درست تاریخی تناظر سے صرف نظر ہے۔ معروف اور قابل اقبال شناسوں کی استثنائی مثالوں سے قطع نظر بالعموم اشعار سے سطحی مفاہیم اخذ کئے جاتے ہیں۔

میں نے جس بات پر اعتراض کیا فیض احمد فیض اسی کے معترف نظر آتے ہیں کیونکہ یہ میری سوچ کے برعکس ہے اس لئے توازن کے لئے فیض کے مضمون "ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات" سے اقتباس پیش ہے :

> "..... میں یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ہمارے ہاں قریباً ہر مکتب فکر کو متاثر کیا ہے۔ اہل تعصب نے ان سے اپنا تعصب مضبوط کیا' اہل نظر نے ان سے اپنی وسعت (نظر) پیدا کی' تنگ نظروں نے ان سے اپنی تنگ نظری کی سند ڈھونڈی اور وسیع النظر لوگوں نے ان سے امداد حاصل کی۔ چنانچہ اہل ہوس نے ان کو اپنی ہوس کے لئے استعمال کیا' اہل جنوں نے اپنے جنوں کی تائید کے لئے استعمال کیا۔ غرض کہ ہماری قومی زندگی اور ہماری ذہنی زندگی میں ان کا اثر ہر ایک مکتب فکر پر پڑا لیکن..... ان سب باتوں میں ایک بات ضرور مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ خواہ ان کے کلام کو لوگ تعصب کے لئے استعمال کریں خواہ وسیع القلبی کے لئے استعمال کریں خواہ اس کو آفاقی نقطۂ نظر سے استعمال کریں خواہ خاص ذاتی نقطۂ نظر سے استعمال کریں لیکن اس کے بارے میں سوچنے' اس کے بارے میں تفکر کرنے اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال کی مثال ہمارے ہاں ایک ندی یا ایک نہر کی سی نہیں ہے جو کہ ایک ہی سمت میں جا رہی ہو بلکہ ان کی مثال تو ایک سمندر کی سی ہے جو کہ چاروں طرف محیط ہے چنانچہ ہم ان کو ایک مکتب فکر نہیں کہہ سکتے ہاں ان کو ایک جامعہ سے یا ایک یونیورسٹی سے تشبیہ دے سکتے ہیں

جس میں طرح طرح کے دبستان موجود ہیں اور طرح طرح کے دبستانوں نے ان سے فیض اٹھایا ہے۔"(۱)

جب مندرجہ بالا کی روشنی میں جمہوریت یا پاکستان میں جمہوریت کی بات کی جائے تو علامہ اقبال کے وہ تمام اشعار ذہن میں آ جاتے ہیں جن میں انہوں نے جمہوریت کو ہدف بنا کر اس کا مضحکہ اڑایا۔ چنانچہ علامہ کے "جمہوریت کش" اشعار تو بلاشبہ پاکستان کی جمہوریت ہی کے بارے میں کہے گئے لگتے ہیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت اور قومی زندگی کا المیہ ہے کہ پاکستان میں جمہوریت بطور ایک مثالی تصور عنقا رہی ہے اور یہ جو عسکریت کے طویل وقفوں کے بعد جمہوریت حباب آسا ابھرتی بھی ہے تو اسے مثالی نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اس ضمن میں جمہوریت کو تقویت دینے والے اداروں کا اساسی کردار فراموش کر دیا جاتا ہے۔ آمروں سے تنگ آئی ہوئی قوم جمہوریت طلب کرتی ہے لیکن جمہوریت میں جب سیاست دانوں کا جمعہ بازار لگتا ہے تو ــــ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟ والی حالت ہو جاتی ہے۔ یوں آمریت کے ساتھ ساتھ سلطانی جمہور کے زمانہ میں بھی علامہ اقبال کے نفی جمہوریت والے اشعار کا چرچا رہتا ہے چند مثالیں پیش ہیں :

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دور استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں !
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

☆

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

☆

متاع معنی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی؟
نہ موراں شوخی طبع سلیمانے نمی آید
گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید؟

ان جمہوریت کش اشعار سے یہ سوال پیدا ہونا لازم ہے کہ علامہ اقبال جیسا روشن خیال مفکر جمہوریت کو کیوں مسترد کر رہا تھا اور وہ بھی ایسے سخت اسلوب میں' ہم علامہ کے برعکس اتنے سخت الفاظ استعمال نہیں کرتے کہ ہم "خر" کے بجائے "اسپ" کہتے ہیں زیادہ عزت افزائی مقصود ہو تو "ہارس" کہہ لیتے ہیں۔ اس نوع کے اشعار کا فائدہ (یا نقصان) یہ ہوتا ہے کہ جہاں ان سے آمریت کو جواز اور تحفظ ملتا ہے وہاں یہ بھی ہے کہ آمریت کے ستائے جب کبھی بھی جمہوریت کا پودا سینچنے لگتے ہیں تو ایسے اشعار نہ صرف آڑے آتے ہیں بلکہ آمرپسند افراد اور مراعات یافتہ طبقہ کے لئے جمہوریت کشی کے لئے قوی دلیل کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور اس کا بنیادی سبب وہی ہے جس کی طرف مضمون کی ابتدا میں اشارہ کیا گیا کہ علامہ اقبال کے افکار کے مخصوص تاریخی تناظر اور زمانی پس منظر کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور یہ بنیادی حقیقت فراموش کر دی جاتی ہے کہ انہوں نے غلام ہندوستان میں شاعری کی اور آزادی سے پہلے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ آج اگر زندہ ہوتے' انہوں نے آمریت میں زندگی بسر کی ہوتی اور مذہبی تشدد کے مظاہرے دیکھے ہوتے تو اس انداز کے اشعار پر دوبارہ غور کرتے :

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

عام تصور کے برعکس جمہوریت جداگانہ سیاسی عمل نہیں بلکہ یہ وطنیت اور قومیت سے تشکیل پانے والی اس سیاسی مثلث کا ایک زاویہ ہے جو اپنی اساس میں مغربی بھی نہیں بلکہ افلاطون جتنی قدیم بھی ہے۔

اس ضمن میں کلام اقبال سے استفادے میں سب سے بڑی الجھن یہی پیش آتی ہے کہ اقبال وطن' قوم' جمہوریت ـــــ تینوں کے مخالف ہیں جبکہ گذشتہ نصف صدی میں مسلم ممالک میں مغربی استبداد کے خلاف تمام تحریکیں قومیت اور وطن کی داعی تھیں یہ الگ بات ہے کہ حصول اقتدار کے بعد بالعموم تیسری شرط یعنی جمہوریت سے آغاز ہی برتا گیا حتیٰ کہ پاکستان بھی جداگانہ وطن کے نام پر حاصل کیا گیا تھا لیکن علامہ اقبال ان سب کو مغربی سیاست کے تصورات

ہونے کی بنا پر مسترد کر دیتے ہیں :

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

"حرف اقبال" سے قوم کے ضمن میں متعلقہ اقتباسات پیش ہیں :

"قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔" (ص: ۱۷۳)

"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں قرآن حکیم میں جہاں جہاں اتباع اور شرکت کی دعوت ہے وہاں لفظ ملت یا امت وارد ہوتا ہے کسی خاص قوم کے اتباع یا اس کی شرکت کی دعوت نہیں۔" (ص: ۲۵۷)

"قوم رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت باعتبار قبیلہ، نسل، رنگ، زبان، وطن اور اختلاف ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن ملت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی گویا ملت جاذب ہے اقوام کی اور خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔" (ص: ۲۵۹)

اور آخری بات مختصر نظم "مذہب" کے حوالے سے :

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

ہمارا المیہ یہ ہے کہ آج پاکستان کو سب سے زیادہ خطرہ غیر ملکی ایجنٹوں اور تخریب کاروں سے نہیں بلکہ ان مذہب نما سیاسی جماعتوں سے ہے جن کے راہنما کلاشن کوف بردار محافظوں کے نرغے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ امر فراموش کر کے کہ موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے اور جن کے "مجاہدین" نمازیوں کو سجدہ کی حالت میں گولیوں سے بھون ڈالتے ہیں۔ آج پاکستان میں اسلام کو غیر مسلموں کے برعکس مسلمانوں کے ہاتھ زک پہنچ رہی ہے جہاں تک اقبال کی مثالی ملت کا تعلق ہے تو نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر کے برعکس ہم تو راوی کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کراچی بھی متحد نہیں۔

کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم قومی مسائل کو اقبال کے اشعار سے کیموفلاج کر رہے ہیں اور تلخی حیات پر فکر اقبال کی شکر چڑھا رہے ہیں ادھر قوم کے پنساریوں نے اقبال کے اشعار کو سونٹھ کی گانٹھ میں تبدیل کر کے ہر مرض کا نسخہ تیار کر رکھا ہے۔

پاکستان میں علامہ اقبال کے جمہوریت کش اشعار سے آمریت کو تقویت دیتے وقت یہ اساسی حقیقت فراموش کر دی جاتی ہے کہ علامہ نے غلام ہندوستان میں مسلمانوں کی عددی اقلیت کی بنا پر جمہوریت کے خلاف اشعار لکھے تھے (اس کے ساتھ ہی یہ بھی بھلا دیا گیا ہے کہ خود قائداعظم پارلیمانی جمہوریت کے علم بردار تھے) علامہ اقبال محض سیاسی نعرہ باز نہ تھے بلکہ سیاسی مفکر تھے اس لئے وہ کانگریس کی ہم نوا مذہبی جماعتوں کے دینی راہنماؤں کے برعکس اس امر کا ادراک کر سکتے تھے کہ ہندو غلبہ کی صورت میں کانگریس کی جمہوریت میں مسلمانان ہند کے لئے فلاح نہیں (جیسا کہ اب عملاً ہندوستان میں ہو رہا ہے) اس لئے نفی جمہوریت والے اشعار کی سیاسی اہمیت سے قطع نظر زمانہ تحریر کے سیاسی اور عمرانی حالات سے صرف نظر کر کے انہیں ان کی ظاہری حیثیت میں بطور سند استعمال کرنا بھی درست نہیں یہ علامہ کے مفکرانہ مرتبہ میں کمی کے مترادف نہیں بلکہ اسے کلام اقبال کی کورانہ تقلید کے برعکس "اجتہاد" کا ایک انداز سمجھا جانا چاہئے۔ کلام اقبال سے استفادہ کے ضمن میں "اجتہاد" اس لئے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ زمانی اور تاریخی تغیرات کی بنا پر متغیر تناظر اشعار کے پیغام کی نوعیت' افادیت اور شدت میں کمی بیشی بھی کر سکتا ہے۔ افکار و تصورات کی دنیا میں کسی بھی نکتہ کو حرف آخر نہیں قرار دیا جا سکتا کہ خود علامہ ہی کے الفاظ میں ـــــ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں۔

علامہ اقبال جمہوریت کے عملی روپ سے بے زار تھے اس کے مثالی تصور کے مخالف نہ تھے چنانچہ "ہندوستان ریویو" (جلد ۲۰-۱۹۰۹ء) میں مقالہ بعنوان "اسلام بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین" میں وہ رقم طراز ہیں :

"..... اسلام محض ایک مجموعہ عقائد نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے۔ یہ ایک امت ہے..... اسلام کی رکنیت کا تعلق نہ پیدائش سے ہے نہ مقامیت سے نہ وطنیت سے بلکہ یہ رکنیت عبارت ہے عقائد کے اشتراک سے..... ایسی امت کے لئے بہترین طرز حکومت جمہوریت ہی ہو گی جس کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک عملی طور پر ممکن ہو آزادی فراہم کر کے آدمی کو اپنی فطرت کے تمام ممکنات کو ترقی دینے کا موقع دیا جائے..... اسلام کا اہم ترین پہلو بحیثیت ایک سیاسی نصب العین جمہوریت ہے۔"

اسی مجلّہ میں ایک اور مقالہ "اسلام میں سیاسی فکر" (۱۹۱۱-۱۹۱۰ء) میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا :

"اسلام ابتدا ہی میں اس اصول کو تسلیم کر چکا تھا کہ فی الواقع سیاسی حاکمیت کی کفیل و امین امت ہے اور جو عمل انتخاب کنندگان اپنا امیر چننے کے سلسلہ میں کرتے ہیں اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ اپنے متحدانہ و آزادانہ عمل انتخاب سے اس سیاسی حاکمیت کو ایک ایسی معین و ممیز شخصیت میں ودیعت کر دیتے ہیں جس کو وہ اس امانت کا اہل تصور کرتے ہیں یوں کہو کہ تمام ملت کا ضمیر اجتماعی اس شخصیت منفردہ کے وجود میں عمل پیرا ہوتا ہے.... اسلام میں قانون سازی کی بنیاد جمہور ملت کے اتفاق و اتحاد رائے پر قائم ہے۔"(۲)

فکر اقبال سے استفادے کے سلسلہ میں بنیادی قباحت سہل انگاری کی پیدا کردہ ہے کہ اسلوب کے مزے دار اشعار تو سب کو یاد ہیں مگر علامہ کی نثر سے عدم توجہی برتی جاتی ہے حالانکہ نثر کو بھی افکار اقبال کی توسیع سمجھنا چاہئے۔

علامہ اقبال نے "خطبات" میں بھی ترکی کے حوالے سے جمہوریت کے مسئلے پر چھٹے خطبہ (الاجتہاد فی الاسلام) میں ارشاد فرمایا :

".... سنی نقطۂ نظر سے خلیفہ یا امام کا نصب چونکہ ایک امر واجب ہے لہٰذا اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منصب خلافت کیا کسی فرد واحد کا حق ہے؟ ترکوں کا اجتہاد یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے تو اس منصب کو افراد کی ایک جماعت بلکہ کسی منتخب شدہ مجلس کے ذمہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہندوستان اور مصر کے علماء نے اس سلسلہ میں ابھی تک کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ اپنی ذاتی حیثیت سے البتہ میرا خیال ہے کہ ترکوں کا یہ نقطۂ نظر سرتا سر درست ہے' اتنا درست کہ اس کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس لئے ایک تو جمہوری طرز حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے ثانیاً اگر ان قوتوں کا بھی لحاظ رکھ لیا جائے جو اس وقت عالم اسلام میں کام کر رہی ہیں تو یہ طرز حکومت اور بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔"(۳)

اس انداز کے مزید حوالے بھی مل سکتے ہیں چنانچہ قائداعظم کے نام مکتوب (۲۸ مئی ۱۹۳۷ء) میں بھی اسی خیال کا اظہار کیا :

"میرے ذہن میں یہ امر بالکل واضح ہے کہ سماجی جمہوریت کو تسلیم کر لینے سے ہندو

مت' ہندو مت نہ رہے گا جبکہ کسی موزوں صورت اور اسلامی قوانین کی مطابقت میں سماجی جمہوریت کو تسلیم کر لینا اسلام کے لئے اتنا انقلابی ثابت نہ ہو گا بلکہ یہ تو اسلام کی حقیقی طہارت کی طرف مراجعت کے مترادف ہو گا اس لئے ہندوؤں کے مقابلہ میں جدید مسائل کا حل تلاش کرنا کہیں زیادہ آسان ہے۔"

اور اگر مراسلے کے ساتھ چھپے خطبے کی اختتامی سطریں ملا لیں تو علامہ کا تصور جمہوریت بالکل واضح ہو جاتا ہے :

"ہمیں چاہیے کہ آج اپنے اس موقف کو سمجھیں اور اپنی حیات اجتماعیہ کی از سر نو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہ نمائی میں کریں تا آنکہ اس کی وہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشو و نما جو اس کا مقصود و منتہا ہے تکمیل کو پہنچ سکے۔"(۴)

اس سے بڑھ کر جمہوریت کی تعریف میں اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

تاریخ پاکستان کی کباب سیخ جیسی کروٹوں کے بعد یہ سوال نامناسب نہیں کہ ہم نے اقبال کے خواب کی تعبیر کے خاکہ میں کیسا رنگ بھرا؟ علامہ کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے؟ اگرچہ اس ضمن میں ان کی متعدد تقاریر اور تحریروں سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے تاہم قائداعظم کے نام قلمبند کئے گئے خطوط اس ضمن میں اساسی حوالہ کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ مئی ۱۹۳۶ء - نومبر ۱۹۳۷ء کے درمیان قلم بند کئے گئے ۱۴ خطوط ان معنی میں یک طرفہ ہیں کہ قائداعظم کے جوابات مفقود ہیں تاہم مسلم لیگ اور پاکستان کے نقطۂ نظر سے ان میں خاصہ اہم مواد ملتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جداگانہ وطن کا تصور پیش کرنے کے بعد قلم بند کئے جانے کی وجہ سے ان خطوط کی سیاسی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں جب ان انگریزی خطوط کا مجموعہ مرتب ہوا تو اس کا دیباچہ قائداعظم نے تحریر کیا اسی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قائداعظم ان خطوط کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

ذیل میں ان خطوط سے منہ بولتی سطریں بلا تبصرہ پیش ہیں .

"ہندوستان کے اندر اور باہر کی دنیا پر اس امر کی وضاحت ازحد ضروری ہے کہ اس ملک میں محض معاشی مسئلہ نہیں ہے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے تہذیبی مسئلہ ہندوستان کے بیشتر مسلمانوں کے لئے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کم از کم اسے معاشی مسائل سے بلحاظ اہمیت کسی طرح سے بھی کمتر نہیں قرار دیا جا سکتا.... میں ہندوؤں پر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کی سیاسی چالیں خواہ وہ کتنی لطیف ہی کیوں نہ

ہوں ہند کے مسلمانوں کو اپنے تہذیبی تشخص سے باز نہیں رکھ سکتیں۔" (۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء)

"اسلامی قوانین کے طویل اور محتاط مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر ان قوانین کو صحیح طور سے سمجھ کر بروئے کار لایا جائے تو کم از کم ہر شخص کی بنیادی احتیاجات پوری کرنے کی ضمانت دی جا سکتی ہے لیکن اسلامی شریعت کا نفاذ اور اس کی نشوونما ایک مسلم مملکت یا مملکتوں کے قیام کے بغیر ناممکن ہے۔ کئی برسوں سے میرا یہ ایماندارانہ عقیدہ رہا ہے اور اب بھی میں اسے درست جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے لئے روٹی اور ہندوستان کے لئے امن و امان اسی طرح سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔" (۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

"... لیکن ان لوگوں کے ایسے حقوق تسلیم کرنے کا کیا فائدہ جن کی غربت کے مسائل حل کرنے میں یہ آئین کسی طرح سے بھی مدد و معاون ثابت نہیں ہو سکتا لہٰذا یہ بے سود ہے۔" (۲۱ جون ۱۹۳۷ء)

"بالآخر مسلم لیگ کو اس امر کا فیصلہ کرنا ہو گا کہ اسے ہندوستان کے مسلمانوں کے بالائی طبقہ کے مفادات کی نمائندگی کرنی ہے یا مسلمانوں کی اکثریت کی، جنہوں نے بہتر وجوہات کی بنا پر اب تک اس میں کسی طرح کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ذاتی طور پر میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ سیاسی جماعت جو مسلم عوام کی بہبود کے لئے کوئی منصوبہ نہیں رکھتی وہ عوام کی کثیر تعداد کے لئے باعث کشش ثابت نہیں ہو سکتی۔ نئے آئین کے بموجب اعلیٰ عہدے بالائی طبقہ کے بیٹوں کو جاتے ہیں، نسبتاً کم بڑے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں، دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی بہبود کے لئے کبھی نہیں سوچا چنانچہ روٹی کا مسئلہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے... اس لئے مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کیسے دور ہو؟ لہٰذا مسلم لیگ کے تمام مستقبل کا انحصار اس کارکردگی پر ہے جو اس مسئلہ کے حل کے لئے ہو گی۔ اگر مسلم لیگ اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتی تو مجھے یقین ہے کہ پہلے کی مانند اب بھی مسلمانوں کی اکثریت اس سے غیر متعلق رہے گی۔" (۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

اس خط کی آخری سطریں علامہ کی جس سیاسی بصیرت کی مظہر ہیں اس کا عملی نمونہ مسلم لیگ گذشتہ ۴۷ برس سے پیش کرتی آ رہی ہے اور جس اقربا نوازی، بے انصافی اور معاشی عدم

مساوات کی طرف علامہ نے توجہ دلائی تھی اسی مسلم لیگ کا ٹریڈمارک قرار پائی۔ جاگیرداروں، وڈیروں، نوابوں اور پیروں پر مشتمل مسلم لیگ نہ صرف یہ کہ ہر آمر کے لئے ریڈ کارپٹ میں تبدیل ہوتی رہی بلکہ اس نے عملاً تصور پاکستان کے مقاصد کی جس طرح سے نفی کی وہ ہماری قومی تاریخ میں المیہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال کے بدترین اندیشے کیوں اس طرح درست ثابت ہوئے کہ ان کا محولہ بالا مراسلہ آج کے اخبار کا اداریہ محسوس ہو رہا ہے اس مثالی تصور کے برعکس جس کا اظہار علامہ نے اپنے خطبہ میں کیا تھا :

"بحیثیت ایک اصول، عمل توحید اساس ہے حریت، مساوات اور حفظ نوع انسانی کی، اب اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ازروئے اسلام ریاست کا مطلب ہو گا ہماری یہ کوشش کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکان کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں۔ وہ گویا ایک آرزو ہے ان اصولوں کو ایک مخصوص جمعیت بشری میں مشہود دیکھنے کی لہٰذا اسلامی ریاست کو حکومت الہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ان ہی معنوں میں، ان معنوں میں نہیں کہ ہم اس کی زمام اقتدار کسی ایسے خلیفتہ اللہ فی الارض کے ہاتھ میں دے دیں جو اپنی مفروضہ معصومیت کے عذر میں اپنے جبر و استبداد پر ہمیشہ ایک پردہ سا ڈال رکھے۔"(۵)

"خلیفتہ اللہ فی الارض" کو اولوالامر آمر سے تبدیل کر دیں تو بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔

پاکستان میں خرابیوں کی بات کرتے وقت کل کی بجائے محض جزو پر زور دیا جاتا ہے اور تاریخ میں سے اپنی اپنی ناپسندیدہ شخصیات یا کسی مخصوص عہد کو تمام خرابیوں کا باعث قرار دے دیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آج پاکستان جو کانٹوں بھری فصل میں تبدیل ہو چکا ہے تو اس کے بیج روز اول سے ہی بو دیئے گئے تھے۔ حکمران مسلم لیگ نے علامہ اقبال کے بدترین اندیشوں کی الاٹ منٹوں کی بندربانٹ، پرمٹوں کی سیاست، سفارش، اقرباپروری کے ساتھ ساتھ عوام کے حقوق غصب کر کے قابلیت، اہلیت اور حق و انصاف کے تمام تقاضوں کو پس پشت ڈال کر صحیح معنوں میں معاشرہ کو جاگیردار وڈیرہ اور کی کمین میں تقسیم کرنے کی طرح ڈالی۔ قبضہ گروپ آج کی اصطلاح سہی مگر اس کی داغ بیل اسی رات ڈال دی گئی تھی جب پڑوسی نے رات کی تاریکی میں دوسرے پڑوسی کے گھر اور مال پر قبضہ کیا تھا۔ دفاتر میں سب سے پہلے محکمہ بحالیات میں رشوت کا چلن شروع ہوا اور آج یہ زہر تمام دفتری نظام میں سرایت کر چکا ہے۔ چنانچہ پہلے دن ہی سے یہاں مراعات یافتہ اور عوام کے درمیان جس خلیج کا آغاز ہوا اس میں

اضافہ ہی ہوتا گیا یوں کہ آج بھی پاکستان ـــــ داغ داغ اجالا شب گزیدہ سحر ـــــ کی تصویر نظر آتا ہے۔

پاکستان مسلم لیگ نے بنایا تھا مگر اس کی بے بنیادی کی ذمہ دار بھی مسلم لیگ ہی قرار پاتی ہے اس لئے کہ یہ بنیادی طور پر جاگیرداروں کی جماعت تھی۔ جمہوریت ناآشنا جاگیردار کو صرف طرہ کے کلف اور زمین سے پیار ہوتا ہے۔ اگرچہ مستند تاریخی کتب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بیشتر جاگیرداروں نے غداری کے باعث انگریزوں سے زمینیں حاصل کی تھیں اور یہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ بیشتر قائداعظم کے خلاف تھے مگر ۱۹۴۶ء تک پاکستان بننے کے امکانات واضح ہو چکے تھے لہٰذا سب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور بالآخر پاکستان کو اپنی جاگیر میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس امر کے باوجود کہ علامہ اقبال "دہ خدا" کے خلاف تھے۔ یہی اسمبلیوں میں آئے' یہی وزیر بنے' سول حکام کو داماد بنایا اور یوں ملک کی ۸۵ فیصد آبادی ۱۵ فیصد کے چاکروں میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

اگرچہ ملک میں سیاسی شخصیات نمایاں تر نظر آتی ہیں کہ یہی ملک کی تاریخ اور جغرافیہ پر براہ راست اثرانداز ہونے کے ساتھ ساتھ واقعات و حوادث کا باعث بھی بنتی ہیں اس لئے بالعموم ان ہی کا تذکرہ رہتا ہے مگر ان شخصیات سے قطع نظر فکری سطح پر جن تضادات کو فروغ دیا گیا ان کے لئے سند بھی علامہ اقبال ہی سے حاصل کی گئی۔ اس ضمن میں عقل دشمنی پر مبنی احتساب' سائنس اور منطق سے بے گانگی' آزاد فکر اور تحقیق و جستجو کے لئے موزوں تر فضا کا فقدان' تحریر و تقریر اور صحافت پر قدغنیں' روشن خیالی پر ٹیبوز مذہب کے نام پر نفی کا کلٹ بنا لینا ـــــ کا بطور خاص نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے مضر اثرات کا بالعموم سیاست دانوں کی کرپشن یا وزیروں کے قول و فعل میں تضادات کی مانند دوٹوک انداز میں مطالعہ نہیں کیا جاتا شاید اس لئے کہ مسائل میں الجھے عوام کی اکثریت کے پاس ان سے بڑے اور فوری نوعیت کے مسائل ہوتے ہے۔ اس فکری بنجرپن کے خوفناک نتائج اب مسجدوں کی سیاست کی صورت میں رونما ہو رہے ہیں' ملائیت فروغ پا رہی ہے اس امر کے باوجود کہ اقبال کو کافر بھی ایک ملا نے ہی قرار دیا تھا۔ خود علامہ اقبال ملا کو کیا سمجھتے تھے اس کا اندازہ ملا کی مذمت میں ان کے پرخشونت اسلوب میں کہے گئے اشعار کے ساتھ خلیفہ عبدالحکیم کی "اقبال اور ملا" سے بھی ہو جاتا ہے۔

آج عوام کی اکثریت کے لئے پاکستان ہتھیلی پر انگارہ کی صورت اختیار کر چکا ہے تو واحد باعث جمہوریت' اسمبلیاں' سیاسی مہم جو اور طالع آزما سیاستدان ہی نہیں بلکہ بنیادی سبب مغل عہد سے مشابہ جاگیردارانہ نظام اپنے تمام جبرواستبداد کے ساتھ' جسے تقویت ملتی ہے خرد سوزی

اور منطق دشمنی پر مبنی ذہنی رویوں سے' جو بنیاد پرستی کی اساس استوار کر کے ملایت کے فروغ کا باعث بن کر فکر نو کی روشنی کے بجائے اندھیرے کو چراغ قرار دیتے ہیں۔ ہم نے تعمیر پاکستان کو کوٹھیوں' محلات' کارخانوں اور پلازا کی تعمیر کے مترادف جانا یوں حاکم اور محکوم دونوں ہی "تعمیر" میں منہمک ہو گئے مگر علامہ اقبال کا یہ شعر کسی کو نہ یاد رہا :

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ہمارے ہاں ہمیشہ سے قدیم اور جدید کی کشمکش رہی ہے بقول علامہ :

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

علامہ اقبال کے اس نوع کے اشعار سے صرف نظر کے نتیجہ میں ہمارے ہاں ہمیشہ سے جہالت کا کٹھ بنا رہا ہے چنانچہ روشن خیالی کے برعکس تاریک خیالی سکہ رائج الوقت ہے۔ آج ہم ذہنی طور سے ازمنہ وسطیٰ کے تاریک یورپ کی فضا میں گویا سانس لے رہے ہیں جہاں پادریوں کا سب سے پسندیدہ مشغلہ جادوگرنیوں کا شکار تھا' جسے چاہا پکڑا اور بے دین ملحد اور کافر قرار دے کر زندہ جلا دیا' کچھ اس کے متوازی عمل یہاں بھی جاری ہے۔ علامہ اقبال ملول تھے :

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

کبھی یورپ ہمارا خوشہ چیں تھا آج معاملہ برعکس ہے کہ علمی تحقیق' علمی لگن اور علمی جستجو کے برعکس ہم تو علوم کا دائرہ تنگ کرتے جا رہے ہیں علامہ نے کہا تھا :

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی !
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

آج عملاً اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی کے علاوہ ہم اور کیا کر رہے ہیں اگر ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ اقوام عالم میں ہم سربلند ہوں تو ہمیں قومی اور انفرادی سطح پر اپنی ترجیحات تبدیل کرنی ہوں گی۔ ہم یورپ پر اقتصادی لحاظ سے تو برتری حاصل نہیں کر سکتے کہ ہم جاپانیوں کی مانند محنت اور دیانت کے عادی نہیں لیکن فکری طور پر تو دنیا کو بہت کچھ دیا جا سکتا ہے لیکن اس عمل کے لئے مخصوص فضا کی تشکیل کے لئے جمہوری اداروں کی تقویت اور خودمختاری کے ساتھ ساتھ کافر سازی' فتویٰ فروشی' فکری قدغنوں اور ذہنی غلامی سے آزاد معاشرہ کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ ایسا معاشرہ جس کا بنیادی اصول دہریہ والٹیر کا یہ قول ہو—— اگرچہ میں تمہاری

اس بات سے تو متفق نہیں لیکن یہ بات کہنے کا حق دلانے کے لئے میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں—— سیاسی جمہوریت نہ سہی فکری جمہوریت تو میسر آ جائے۔ گر یہ نہیں تو بابا باقی کہانیاں ہیں!

وہ قوم جس نے عزم و ہمت سے دنیا کے نقشہ پر اپنے وطن کا نقش اجاگر کیا—— ہوئے احرار ملت جادہ پیما کس تجمل سے—— کی تصویر بن کر، آج ۴۷ برس بعد بھٹکی اور ٹھٹھکتی نظر آتی ہے۔ ہمارا مستقبل کیا ہو گا؟! میں جین ڈکسن تو نہیں سو غالب سے مدد چاہی تو صریر خامہ نوائے سروش میں یوں رقم طراز ہوا :

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

۱۔ "اقبال" مرتبہ شیما مجید ص ۳۷-۳۶
۲۔ بحوالہ "صحیفہ اقبال" مرتبہ یونس جاوید ص ۴۵۰
۳۔ "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" ترجمہ نذیر نیازی ص ۴۴۳-۲۲۲
۴۔ ایضاً ص : ۲۳۸
۵۔ ایضاً ص : ۲۳۸

بزم اقبال کی نئی مطبوعات

(۱) مقالات شریف	پروفیسر ایم۔ ایم شریف مرحوم	۱۵۰ روپے
(۲) کشاف اصطلاحات فلسفہ (Dictionary of Philosophy)	(مولف) ڈاکٹر سی اے قادر/ رانا اکرام	۳۰۰ روپے
(۳) اقبال کا فکر و فن (طبع سوم) (نستعلیق کمپوزنگ)	ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر افضل حق قرشی	۷۵ روپے
(۴) اقبال شناسی اور بلوچستان کے کالج میگزین (جلد اول دوم۔ طبع دوم)	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۵۰ روپے
(۵) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (طبع چہارم)	سید نذیر نیازی	۷۰ روپے
(۶) کلیات اقبال اردو (بہ اشتراک اقبال اکادمی لاہور) سستا عوامی ایڈیشن		۴۵ روپے
(۷) اقبال اور اسلامی روایت	عبد العزیز کمال	۸۰ روپے
(۸) اسلام اور اصول حکومت	شیخ علی عبد الرزاق مترجم : محمد فخر ماجد	۸۰ روپے
(۹) علامہ اقبال کی تاریخ ولادت	مرتبین : ڈاکٹر وحید قریشی زاہد منیر عامر	۱۵۰ روپے
(۱۰) قائد اعظم : تقاریر و بیانات (جلد اول)	ترجمہ : اقبال احمد صدیقی	۲۰۰ روپے
۱۱۔ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر	شیخ محمد اقبال / مولانا ظفر علی خان	۳۰ روپے
۱۲۔ مکاتیب اقبال / بنام خان محمد نیاز الدین خان (طبع دوم)	بزم اقبال	۳۰ روپے

بزم اقبال کے طباعت کے آئندہ منصوبے

۱۔ Speeches, Statements & Messages of the Quaid-i-Azam Vol: I 1934 to 37	مرتب خورشید احمد خان یوسفی
۲۔ قائد اعظم : تقاریر و بیانات (جلد دوم)	مترجم اقبال احمد صدیقی
۳۔ اشاریہ کلام اقبال (فارسی)	زبیدہ بیگم / ڈاکٹر ظہور الدین

بزم اقبال ۲ کلب روڈ لاہور فون : ۶۳۶۳۰۵۶